مادّیت اور رُوحانیت

محمد فاروق خاں ایم۔اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

مادیّت اور رُوحانیت

نیکی اور بدی کا تصوّر انسان کے لیے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ تاریخ کسی ایسی قوم کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس میں نیکی و بدی کا سرے سے کوئی تصوّر نہ پایا جاتا رہا ہو۔ اخلاق کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جو لوگ نظریۂ جبریت (DETERMINISM) کے قائل ہیں وہ بھی سچّائی کے مقابلہ میں جھوٹ کو، ایفائے عہد کے مقابلہ میں مکر و فریب کو، ایثار و قربانی اور جذبۂ اخوت و ہمدردی کے مقابلہ میں خود غرضی، بغض و عناد اور جور و ظلم کو سراہنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور نہ علی الاعلان وہ اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک جھوٹ اور سچ، ایمان داری اور بے ایمانی سب کی حیثیت یکساں ہے۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ سچّائی، خیر پسندی اور سلامت روی انسان کی مطلوبہ صفات ہیں اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

انسانوں سے کسی خاص قسم کے اخلاق کا مطالبہ یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم انسان کو ارادہ و اختیار کا مالک جانتے ہیں۔ اخلاق کا تعلق انسان کے ارادہ و اختیار سے ہے۔ جہاں صرف جبر کی کارفرمائی ہو وہاں کسی اخلاق و کردار کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ انسان اپنا ایک اخلاقی وجود رکھتا ہے یہی چیز اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ مادیت سے مفہوم ایک طرح کا جبری اصول ہوتا ہے جس میں ساری کارفرمائی بے جان مادہ کی ہوتی ہے۔ جس میں قصد واختیار اور شعور کا کوئی دخل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سائنس داں جو نظریۂ جبریت کے قائل ہیں ان کے نزدیک انسانی حرکات واعمال طبعی قوانین کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح چاند اور سورج کی گردشیں طبعی قوانین کی پابند ہیں۔ ان کے نظریے کی رو سے انسان کے تمام افعال وکردار میکانکی (MECHANICAL) قوانین کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ اس میں نیچر (NATURE) کا وہی عمل کارفرما ہوتا ہے جو پانی کو آگ پر رکھنے سے بھاپ بن کر اُڑ جانے میں ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں کسی مافوق الطبیعی نظام کی بات بالکل لچر اور مہمل ہے۔

مادّی نقطۂ نظر سے ہر شئے کا عنصر ایک ہے۔ مرکز سالمہ (PROTON) اور برقیہ (ELECTRON) کی مختلف تعداد سے مختلف اشیاء کی تعمیر ہوتی ہے۔ ثقیل اجسام برقی لہروں کے اجتماع کے مناظر ہیں۔ سکون کسی شئے میں نہیں۔ ہر شئے کے ذرّات ہمیشہ تیزی سے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس سے ہر شئے کی صورت لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے جس سے ہمارے اعصاب بھی بہ حیثیت مجموعی بدلتے رہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہمارے افعال وخیالات ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ کشش کے ذریعہ تمام ذرّات میں باہم ربط وتعلق ہے، اس لیے چھوٹی سے چھوٹی چیز کی حرکت کا اثر عالمگیر ہوتا ہے۔ یہ اثر تمام نظامِ عالم پر پڑتا ہے۔ اگر ہمیں کسی خاص وقت کائنات کے تمام ذرّات کی کیفیت معلوم رہے تو اس کے ذریعہ ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ کسی کے خیالات اور افعال مستقبل میں کیا ہوں گے۔ غرضیکہ مادہ پرستوں کے

نزدیک ہمارے افعال وخیالات کو ہمارے ذاتی ارادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔چنانچہ
شین (SHEEN) نے کہا ہے کہ زندگی پروٹو پلازم (PROTOPLASM) کی توانائی
ہے اور نفس (PSYCHOPLASM) کی توانائی۔شعور انسانی دماغ کی مرکزی قوت
(ASSOSIATIVE GENTREE OF BRAIN) کا نام ہے۔یعنی نفس (MIND)
توانائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

یہی وہ میکانی تصور حیات (MECHANICAL CONCEPT OF LIFE
ہے جس کی رو سے انسان کی زندگی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) تک محدود
ہو کر رہ جاتی ہے۔گوشت پوست کے علاوہ انسان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔
لیکن اب نظریہ مقادیر عنصری (QUANTUM THEORY) نے سائنس کی تحقیقات
کی دنیا سے علت ومعلول کو یکسر خارج کر دیا ہے۔اس کی جگہ اب غیر متعین قانون
(INDETERMINACY) کارفرما ہے۔آئزن برگ (WERNER HEISEN
BERG) کے اصول کے مطابق ایک برقیہ (ELECTRON) مقام (POSITION)
اور رفتار (VELOCITY) دونوں رکھتا ہے۔لیکن بیک وقت ہمیں دونوں کا علم
نہیں ہو سکتا۔اس کا مقام جس قدر یقین کے ساتھ متعین کیا جائے گا اسی قدر اس کی
رفتار غیر متعین ہو جائے گی۔سائنس کے لیے یہ بتانا ممکن ہی نہیں کہ ایک برقیہ چھلانگ کر
کدھر جائے گا۔اس بنا پر سائنس داں حضرات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فکرِ انسانی میں علت و
معلول کا قانون کوئی لازمی عنصر نہیں ہے۔پرانے نظریہ علت ومعلول کی رو سے انسان
مجبور محض تسلیم کیا جاتا تھا۔اب اس نظریہ نے انسان کے صاحب ارادہ واختیار ہونے
کے لیے ایک طبعی دلیل بہم پہنچادی ہے۔چنانچہ سر جیمز جینس اپنی کتاب

(MYSTERIOUS UNIVERSE) میں لکھتے ہیں:

"ہمارے ارادہ واختیار کے عقیدے کے خلاف سائنس کے پاس
اب کوئی ناقابلِ تردید دلیل نہیں رہی۔"

حقیقت یہ ہے کہ سائنس حیات کی تشریح سے بالکل قاصر ہے۔ ذی روح ہستی کے کردار کی میکانی توجیہ ممکن نہیں ہر شخص اپنے اندر ارادۂ واختیار کی آزادی محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں۔ انسان کے ارادۂ واختیار کسی مادّی قانون کے محتاج نہیں ہیں۔ مادّیت کی کارفرمائی کی صورت میں "شعور" وجود ہی میں نہ آسکتا پھر نہ انسان ارادۂ واختیار کی کوئی آزادی محسوس کر سکتا اور نہ انسانی افراد کے اندر کسی قسم کی انفرادیت پائی جاتی۔ جسمانی تغیّرات ہماری شخصیت پر قطعًا اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انسان مادّیت سے الگ ایک مستقل اور غیر مادّی ہستی ہے۔ مادّی جسم کے ذریعہ اس ہستی کا صرف اظہار (MANIFESTATION) ہوتا ہے۔ شعور کو سائنس کے طرز پر سمجھنا ممکن نہیں۔ بے شعور مادّہ کا مطالعہ ایک مادّی تحقیق ہے۔ شعور کی تشریح مادّی اسباب کے ذریعہ ممکن نہیں۔ میکس پلانک (MAX PLANK) نے کہا ہے:

"کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو محض علت ومعلول کے قانون کی رُو سے اپنے شعوری افعال کی فیصلہ کن محرکات کے متعلق کبھی بھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے کسی اور قانون یعنی قانونِ اخلاقیات کی ضرورت ہے۔ اس قانون کی جگہ نہ تو بلند ترین عقل لے سکتی ہے۔ اور نہ لطیف ترین نفس اس کی جگہ لے سکتا ہے[1]۔"

---

[1] دیکھیے: THE UNIVERSE IN THE LIGHT OF MODERN PHSYCS

انسان کو اخلاق و کردار کا حامل قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ارادۂ واختیار کا مالک مانا جائے۔ جب تک نفس انسانی کی کوئی مستقل حیثیت تسلیم نہ کی جائے ہم انسان کو صاحب ارادۂ واختیار نہیں قرار دے سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نفس انسانی کی ایک مستقل حیثیت ہو۔ اس کی اپنی ایک مستقل زندگی ہو جو مادّہ کی رہینِ منت نہ ہو۔ وہ اپنے اعمال کا سبب آپ ہو۔ جسمانی تغیرات اس کے روحانی وجود پر اثرانداز نہ ہو سکتے ہوں۔

اخلاق و کردار کے لیے ارادۂ اختیار کی آزادی کے علاوہ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ اخلاقی اقدار[1] کا ایک مستقل و مطلق معیار ہے۔ جو ہر شخص کے لیے یکساں ہے۔ اخلاقی قدروں کی قیمت اضافی (RELATIVE) نہ ہو بلکہ مطلق (ABSOLUTE) یا ذاتی (INTERINSIC) ہو۔ اس قسم کی چیزیں اخلاقیات کی دنیا میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUESES) کہلاتی ہیں۔ انھیں کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ ان سے کم قیمت اضافی (RELATIVE) اقدار کو ان کے تحفظ کے لیے قربان کیا جاسکتا ہے۔

انسانی زندگی میں کسی اعلیٰ اخلاقی نظام کا تصور اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہماری زندگی کا کوئی ایسا مقصود و منتہا ہو جو ایک مطلق قدر رکھتا ہو۔ جس کی طرف اپنی تمام کوششوں کو لے جانا "عملِ خیر" قرار پا سکے۔ تکمیلِ انسانیت کے لیے جس تک پہنچنا ناگزیر ہو۔ چنانچہ برگساں اسی بنا پر یہ ماننے پر مجبور ہوا ہے کہ:

---

[1] اخلاقی اقدار کا مسئلہ تفصیل طلب ہے۔ اس موضوع پر الگ سے گفتگو کی ضرورت ہے۔

" زندگی کی تمام تگ و تاز کا منشاء تخلیق نوعِ انسانی کی تکمیل ہے۔ یعنی انسانیت (HUMANITY) کو وہ کچھ بنا دینا جو کچھ فی الفور بن جاتی اگر اسے اپنی شکل اختیار کر لینے میں انسانوں کی مدد درکار نہ ہوتی۔"[1]

انسان کو اس کی اپنی زندگی کا کوئی ایک بلند مقصود و منتہا ہی ہر فکری و عملی گمراہیوں اور ہر قسم کے تلون و انتشار سے بچا کر فطرت کے صحیح راستہ پر لگا سکتا ہے۔ جس پر چل کر وہ تکمیلِ انسانیت کے مراحل طے کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اسلام میں اخلاقِ انسانی کی اصل بنیاد سزا کا خوف نہیں سچائی کی محبّت ہے۔ صداقت کا حصول ہے۔ اخلاق انسانی کے جتنے اصول و تقاضے بیان کیے جاتے ہیں، جب تک وہ اپنے دل کی اعلیٰ ترین امنگیں نہ بن جائیں دل و دماغ بدستور گنہگار رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے لوگ اس گناہ کی زد سے بچ جائیں۔ اخلاقی تقاضے اسی وقت تک دل کی امنگیں بن سکتے ہیں جبکہ ہمیں اپنے حقیقی جذبات و احساسات کی پہچان ہو جائے۔ ہم اپنے اندرونی تضادات میں جو ہماری غفلت کی پیدائش ہیں وحدت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اخلاقی مطالبات درحقیقت ہماری ہی فطرت کا اظہار ہیں۔ اخلاق درحقیقت ایک عالمگیر اصول ہے۔ وہ ہماری اندرونی زندگی کا قانون ہے۔ اخلاق کی محدود اور بوقلموں صورتوں کے پیچھے اسی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ صرف اسی کے ذریعہ انسان کی اندرونی زندگی میں توازن پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک اپنی اندرونی زندگی میں توازن

---

[1] دیکھیے: THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION

نہ پیدا ہو جائے، باہر کی زندگی میں کبھی بھی توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اپنی اندرونی دنیا پر قبضہ پائے بغیر ہماری روحانی تکمیل کی تمنّا تسکین نہیں پا سکتی۔ حقیقی سکون وراحت ہمارے لیے ممکن الحصول نہیں بن سکتے۔

اوسپنسکی (OUSPENSKY) نے لکھا ہے کہ:

"انسان جب تک اپنے اندرونی تضادات میں وحدت قائم نہ کر لے اسے اپنے کو آنا (I) کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔ جس نے یہ وحدت حاصل نہ کر لی ہو وہ اگر اپنے کو صاحبِ اختیار وارادہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ "ارادہ" تو نتیجہ ہوتا ہے خواہشات کا۔ جس شخص کی خواہشات مستقل نہ ہوں، وہ محض اپنے جذبات اور خارجی تأثرات کا کھلونا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ دوسرے ہی سانس میں وہ کیا کہہ دے گا اور کیا کرے گا۔ اس کی زندگی کا ہر سانس اتفاقات کے پردوں میں گم ہوتا ہے۔

(THE NEW MODEL OF UNIVERSE P. 132-133)

داخلی توافق کے بغیر معاشرے میں کبھی توافق اور وحدت کی جلوہ گری ممکن نہیں۔

جہاں تک مطلق اخلاقی اقدار کے حصول وعلم کا مسئلہ ہے، حقیقت (REALITY) کے علم کے بغیر اس قسم کے مطلق اخلاقی اقدار کا علم ممکن ہی نہیں ہے۔ راشڈل نے لکھا ہے کہ:

"یہ ممکن ہی نہیں کہ حقیقت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نگاہ اخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو یا ہمارے اخلاقی نقطۂ نظر سے ہمارا تصورِ حقیقت متاثر نہ ہو۔"

ایک مطلق اخلاقی قانون یا اخلاقی مطمحِ نگاہ مادّی اشیاء میں نہیں مل سکتا۔

اخلاق کا مرتبہ مادیت اور افادی نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ بلند ہے۔ مستقل اور مطلق اقدار کو مانے بغیر کسی اعلیٰ اخلاق کا تصور ممکن نہیں۔ مستقل اور مطلق اقدار کو ماننے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی کوئی غرض وغایت ہو۔ کائنات کسی مقصد کے تحت وجود میں لائی گئی ہو۔ کائنات اور کائنات کی تمام چیزوں کی حیثیت محض ایسے سامان واسباب کی ہو جس کے ذریعہ انسانی روح اپنے مقصد تک پہنچ سکے۔

اخلاق وکردار کے سلسلہ میں تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ انسان کا تسلسلِ حیات پر ایمان ہو۔ وہ زندگی کو مسلسل اور مستقل سمجھتا ہو۔ مستقل اقدار سے اسی وقت انسانی سیرت کی تعمیر ہو سکتی ہے جب کہ انسان دائمی حیات کا قائل ہو۔ وہ یہ جانتا ہو کہ انسان کے موجودہ اعمال اس کے مستقبل کو متأثر کرتے ہیں۔ جس معاشرے کے افراد کا منتہائے خیال قریبی مفاد کا حصول ہو اس معاشرے میں نہ تو کبھی استحکام پیدا ہو سکتا ہے اور نہ کبھی اس میں توازن برقرار رہ سکتا ہے۔ سیرتوں کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ اس کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان رکھتا ہو۔ ہمارے نفس کا مقصود ومنتہیٰ ایک نفسِ مطلق ہی ہو سکتا ہے۔ ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل نفسِ مطلق ہی میں موجود ہو سکتا ہے۔ جو تمام حقیقتوں کا سرچشمہ اور ہماری ہستی کا اصل مرکز ہے۔ ہر انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے ایک ذات (PERSONALITY) رکھتا ہے۔ یہی ذات اس کی تشریف وتکریم کی باعث ہے۔ انسانی ذات غیر تربیت یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں ہوتی ہے۔ جب انسان تربیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے داخلی تضادات (CONTRADICTION) ہم آہنگی سے

بدل جاتے ہیں۔ انسانی ذات کی صحیح تربیت (REAL DEVELOPMENT) ممکن نہیں جب تک کہ انسان اپنی ذات کا مقصود و منتہا خدا کی اس ذات (PERSONALITY) کو نہ قرار دے جو مکمل ترین ذات (PERFECT IN HIS PERSONALITY) ہے۔ خدا اور حیاتِ اُخروی پر ایمان لائے بغیر مستقل اور مطلق اقدار کا تصور ممکن نہیں۔ جب تک انسان کے نفسیاتی پس منظر میں حاضر و ناظر معدلت پسند خدا کا عقیدہ جاگزیں نہ ہو جائے فرد کی تربیت و اصلاح اور معاشرتی و تمدنی عدل و انصاف کا قیام صحیح معنوں میں ممکن نہیں۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت اخلاقی اقدار کا حصول ہے۔ صرف اخلاق ہی ایک ایسا قابلِ قدر جوہر ہے جس کے ذریعہ روحانی، مادی اور جمالیاتی (AESTHETIC) قدر و قیمت میں توافق اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی کے ذریعہ معاشرے میں پائے جانے والے تضادات باہمی توافق میں بدل جاتے ہیں۔ صرف اخلاق ہی کے ذریعہ انسان کی زندگی اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جو تغیرات سے بلند و بالا ہے۔ حقیقت کے ساتھ زندگی کی اسی ہم آہنگی اور توافق کا نام حقیقی آزادی اور صداقت کا حصول ہے۔ کائنات کی توجیہ و تعبیر اخلاقی اقدار کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں۔

انسانی زندگی کے لیے کسی ایسے اخلاقی نظام کا تصور جس کی بنیاد مادیت کے بجائے معنوی اور عالمگیر اصول پر قائم ہو، کوئی ایسا تصور نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس کا انسانی زندگی سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ہر دنیوی معاملہ میں کوئی نہ کوئی معنوی اور روحانی نقطۂ نگاہ رکھنے پر مجبور ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا ایک دن بھی گذارنے پر کوئی قادر نہیں ہو سکتا۔ انسان غیر شعوری طور پر

اپنا کوئی کام انجام نہیں دیتا۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کا علم وارادہ کام کرتا ہے۔ وہ بامقصد کام کرنا چاہتا ہے۔ مآل اندیشی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ کسی اعلیٰ مقصد کا تصور اور کسی حقیقی انجام تک پہنچنے کی فکر زندگی کی موجودہ صورتِ حال کا عین تقاضا ہے۔ اخلاق کا عالمگیر اصول ہر حل طلب مسئلہ کے لیے ایک رہنما اصول ہے۔ بشرطیکہ اسے مستقل اور مطلق اقدار کی حیثیت حاصل ہو۔ مادّہ کو اصل کارفرما قوّت قرار دینے کے بعد اخلاقی اعمال کے لیے کوئی تحریک باقی نہیں رہتی۔ مادّیت کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے کہ کوئی کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کیوں کرے؟ کوئی ایثار پسند خلیق اور متحمل مزاج کیوں بنے؟ کوئی اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل کیوں کرے؟ اپنے قریبی مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام کیوں آئے؟ اس میں شبہ نہیں کہ مادیت کے علمبرداروں میں ایسے اشخاص ملتے ہیں جنہوں نے قربانیاں دی ہیں۔ مفلسوں، ناداروں اور مظلوموں کی حمایت کی ہے۔ لیکن ان کا یہ کام ان کے بنیادی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یقیناً یہ مادّیت کا نہیں مادّیت سے ماوراء کسی اور شے کا اثر ہے جو اُن کے نفس ہی کے کسی گوشے میں چھپا ہوا تھا۔

مادّیت (MATERIALISM) اور لامذہبیت اپنی ذات کے اعتبار سے بالکل ایک تخریبی چیز ہے۔ خدا کا انکار، روح کا انکار اور کائنات کی غرض وغایت کا انکار، انھیں چند انکاروں پر اس کی پوری عمارت قائم ہے۔ مادّیت کو کوئی اثباتی و ایجابی (POSITIVE) حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے انسانی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ زوزف وڈکرچ نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ

جب وہ مذہبی خیالات سے دست بردار ہوا تو اُسے نہ صرف ذہنی کوفت اور روحانی کرب کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اخلاقیات کے بارے میں تو اُسے بالکل مایوس ہو جانا پڑا۔

خدا کے انکار کے بعد نہ صرف یہ کہ دنیا اپنی محبوبیتوں سے یکسر خالی ہو جاتی ہے، زمین کی حیثیت نہ صرف یہ کہ ایک تاریک اور اجنبی ستارہ کی رہ جاتی ہے بلکہ انسانی زندگی سے اطمینان وسکون ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی قوانین کی پاس داری کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عہد و پیمان کا پاس و لحاظ ابلہی کا ہم معنیٰ قرار پاتا ہے۔ انسانی زندگی "کھاؤ پیو اور خوش رہو۔" (EAT, DRINK AND BE MERRY) کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی۔ مادہ پرستوں کو سائنس اور اس کی تحقیقات و ایجادات پر بہت ناز ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کا راز پا لیا ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ سائنس زندگی کو بامقصد اور باغایت بنانے سے یکسر قاصر ہے۔ سائنس یہ تو بتا سکتی ہے کہ پانی اور کاربن کس طرح کیمیاوی تبدیلی (CHEMICAL CHANGE) کے ذریعہ شکر میں اور آکسیجن و ہائیڈروجن گیس پانی میں تبدیل ہوتے ہیں، لیکن انسانی حیات کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ اخلاق و کردار کی توقع اسی زندگی سے کی جا سکتی ہے جو باغایت و بامعنی ہو۔ جس کا کوئی مقصد ہو، ایسا مقصد جس کے لیے آدمی زندہ رہے اور جس کے لیے ضرورت کے وقت اپنی جان بھی دے سکے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نیکی، صداقت پسندی اور ہمدردی و رحم دلی وغیرہ صفات تو انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ اس کے لیے کسی معنوی نقطۂ نظر کے

قبول کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ اس کے لیے حیات کے تسلسل پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایثار، قربانی اور ہمدردی و رحم دلی وغیرہ اعلیٰ اوصاف کا انسان کی فطرت سے نہایت گہرا تعلق ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں بھی انسان جھوٹ اور سچ کو ایثار اور خود غرضی کو رحمدلی اور بے رحمی کو یکساں حیثیت نہیں دے سکا۔ ایثار اور خود غرضی میں بہرحال وہ فرق کرنے پر مجبور ہے۔ اسی طرح جھوٹ اور سچ کو وہ ایک نہیں کہہ سکتا۔ وہ جھوٹ کے مقابلے میں سچائی کو سراہنے پر مجبور ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اسے کوئی دھوکا دے یا اس پر کسی طرح کا ظلم ہو۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انسان کی ذات غیر تربیت یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں ہوتی ہے۔ تہذیب و تربیت اور تزکیہ کے بغیر انسان اپنی فطرت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور نہ اپنے فطری تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کسی کو دھوکا دینا اچھا نہیں۔ وہ اپنے بارے میں پسند نہیں کرے گا کہ کوئی اسے فریب دے کر نقصان پہنچائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ موقع پا کر مادّی اغراض کے لیے دوسروں کو فریب دے سکتا ہے۔ اگر قریبی مفاد کے سوا اس کے پیشِ نظر کوئی اور مفاد نہیں۔ اگر اس کے دل میں خوفِ خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس نہیں تو پھر کیوں وہ اپنے دل کی بے معنی آواز پر دھیان دے کر نقد فائدوں سے محروم رہے۔ اگر تہذیب و تزکیہ کے بغیر ہی انسان اپنی فطرت پر قائم رہ سکتا تو دنیا میں فتنہ و شر کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا۔ انسان کے تزکیہ و تربیت کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند معنوی نقطۂ نظر پیش کریں، جو اسے خود غرضی اور تنگ نظری سے بچا کر دوسرے انسانوں کا سچا بہی خواہ اور ہمدرد و غمگسار

بنا سکے۔

وہ لوگ جن کے پاس مسائل کو سمجھنے کے لیے افادی نقطۂ نظر کے سوا کوئی نقطۂ نظر نہیں، جن کے پاس مادّی معیار کے سوا کوئی دوسرا معیار نہیں ممکن ہے یہاں یہ کہیں کہ انسان کی تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کا سبب صرف اس کی تنگدستی اور مفلسی ہے۔ اگر انسان تنگ دستی و ناداری میں مبتلا نہ ہو تو پھر وہ ظلم و زیادتی کے قریب بھی کیوں جائے گا۔ وہ معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں جن کے سبب انسان غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔ حقیقت میں کوئی شخص بھی گنہگار نہیں ہے حالات انسان کو گنہگار بناتے ہیں۔ انسان جس ماحول اور جس معاشی نظام سے گھرا ہوا ہوتا ہے اس سے الگ وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کسی بھی دور کے انسان کو سمجھنے کے لیے صرف اتنا کافی ہے آپ اس دور کے ذرائع پیداوار سے واقفیت بہم پہنچا لیں۔ معاشی نظام کی ہیئت ہی میں انسان کا سارا راز پوشیدہ ہے۔ یہ مذہب و اخلاق، تہذیب و کلچر سب معاشی صورت حال کی پیداوار ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ حقائق کا نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہمیں ملیں گے جو تنگ دست، مفلس یا مظلوم نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ظلم و سرکشی میں وہ کسی سے بھی پیچھے نہیں۔ دولت کی فراوانی کے باوجود اس میں مزید اضافہ کی فکر انھیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ انھیں صرف سمیٹنا آتا ہے۔ وہ جائز و ناجائز کچھ نہیں جانتے۔ چند پیسوں کے لیے وہ ایسی انسانیت سوز حرکتیں کر گزرتے ہیں جن سے ہر حساس دل لرز اٹھے گا۔ مجبور و بے کس کی مجبوریوں سے وہ خوش ہوتے ہیں کہ اس کی محنتوں کا نتیجہ سود کی شکل میں صرف انھیں کے حصوں میں آتا رہے گا۔

یہاں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان خرابیوں کا سبب دولت نہیں، سرمایہ دار کی جہالت اور اس کی خود غرضی ہے۔ اگر لوگ تعلیم یافتہ ہوں، اگر انھیں ترقی یافتہ معاشرہ حاصل ہو تو اس طرح کی گھناؤنی حرکتیں ان سے ہرگز سرزد نہ ہو سکیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سی مادی تعلیم ہے جو انھیں افادی نقطۂ نظر کے علاوہ دوسرا نقطۂ نظر عطا کرے گی۔ جو اُن کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرے گی۔ جو انھیں قریبی مفاد کی طمع، خود غرضی اور حرص و ہوس سے پاک کر سکے گی۔ تعلیم بھی تو لوگوں کو اسی بات کی دی جائے گی کہ دولت ہی سب کچھ ہے۔ انسانیت کی تاریخ معاشی کشمکش کی ایک طویل داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذرائع پیداوار اور اس کے ذریعہ سے قومی اور عصری ارتقاء کی ہیئت ہی وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر قانون زندگی، اخلاق، فنونِ لطیفہ اور مذہبی تصورات کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ انسانی سماج کی ہیئت کا تعین صرف ذرائع پیداوار سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تعلیم سے تو آدمی اپنے کو دولت اور ذرائع پیداوار کا نہ صرف ضرورت مند بلکہ پرستار تصوّر کرے گا۔ وہ سمجھے گا کہ انسانی زندگی میں ذرائع پیداوار اور پیداواری طاقتیں ہی سب کچھ ہیں۔ اس طرح کی تعلیم کے ذریعہ تو دلوں سے مال کی محبت نہیں نکل سکتی۔ پیداواری طاقتوں اور ذرائعِ پیداوار ہی کو دنیائے انسانیت میں سب کچھ سمجھ بیٹھنا دماغی خودکشی کے مترادف ہے۔ ذرائع پیداوار انسانی دماغ کے اعمال و افعال کی پوری پوری تشریح کرنے سے عاجز ہیں خود انسانی دماغ کی چھاپ ذرائعِ پیداوار اور پیداواری طاقتوں پر پڑتی ہے۔ مادی قربانی کے بغیر معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام ممکن نہیں۔ مادی قربانی آدمی صرف اس وقت پیش کر سکتا ہے جب کہ اُس کے

پاس زندگی کا مادّی معیار نہ ہو، وہ مادّیت سے بالاتر کوئی معنوی نقطۂ نگاہ بھی رکھتا ہو۔

یہ خیال کہ سرمایہ داری ہی تمام فسادوں کی جڑ ہے۔ اسی سے تمام اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ سے اگر اس کا سرمایہ چھین کر اسے عام سطح پر کر دیا جائے تو اس سے تمام اخلاقی خرابیوں کا استیصال ہو جائے گا۔ یہی سرمایہ دار جو آج غریبوں کا خون چوستے ہیں کل ان کے ہمدرد بن جائیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام ان کے لیے اخلاق کے بلند مرتبہ تک پہنچنے میں روک بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس دعوے کی پشت پر کوئی دلیل نہیں۔ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ اس طرح سرمایہ دار مجبور ہو کر ناداروں اور کمزوروں کو اپنے سودی جال میں نہیں جکڑ سکتا، معمولی قیمت پر جو ضروریات زندگی کے لیے بالکل ناکافی ہوتی ہے، وہ مزدوروں کی محنتوں کا تنہا مالک نہیں بن سکتا۔ لیکن اس سے اس کی سب سے محبوب شے (سرمایہ) کے چھن جانے کے ردِّ عمل میں حکمراں پارٹی یا اس طبقے کے خلاف جس کی حمایت میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا، اس کے اندر جو بغض و عناد کا جذبہ اُبھرے گا آخر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ ظالم کا ہاتھ تو آپ نے پکڑ لیا لیکن اسے خوش اخلاق اور انسانوں کا ہمدرد بنانے کا آپ کے پاس کیا نسخہ ہو سکتا ہے؟ اس طرح ظلم کا ایک دروازہ بند ہو گیا لیکن اس کے نتیجہ میں جو دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں آپ ان کو کیا کریں گے؟ جب سرمایہ ہی برائی کی اصل جڑ ہے، تو اسے کسی کی بھی تحویل میں رکھنا سماج کی تباہی کے مترادف ہے۔ حکومت کی طاقت خود ایک بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے ساتھ مملکت کے سارے باشندوں کی ملکیتیں اور سرمایہ داروں سے ان کا سرمایہ بھی اگر چھین کر اسی حکمراں طبقہ کو سونپ دیا جائے تو وہ کون سی چیز ہو گی جو ظلم و سرکشی سے اُسے باز رکھے گی۔ کیا حکمراں طبقہ کے لوگ اس طرح پبلک پر اپنی خدائی کا ٹھاٹ نہیں جمائیں گے۔ آخر اس کی کیا گارنٹی ہے

کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ کون سا جذبہ و فکر ہوگا جو انھیں اس کام سے بچا سکے گا۔ اس سلسلے میں روس کے واقعات اور اسٹالن کے خلاف خروشچیف کا بیان کیا ہمارے لیے کم عبرتناک ہے۔ جب برائی سرمایہ داری کی خمیر میں داخل ہے تو یہاں ہم اس بات کو کیوں بھلا دیتے ہیں؟ کیا سرمایہ حکمراں پارٹی کے پاس پہنچکر سرمایہ نہیں رہتا یا وہ اپنی تاثیر کھودیتا ہے۔؟

یہ بات کہ حکمراں پارٹی اگر پبلک پر ظلم کو روا رکھے گی تو آنے والے الکشن میں پبلک اپنے ووٹوں سے اسے محروم کردے گی جس کے نتیجہ میں اسے اپنی جگہ خالی کردینی پڑے گی۔ لیکن یہ ایک خیال خام ہے۔ وہ طبقہ جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو، لوگوں کے رزق کی کنجیاں بھی جس کے قبضہ میں دے دی گئی ہوں وہ اپنے کو حکمرانی کے بلند و برتر مقام پر فائز رکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ آنے والے خطرے کی پیش بندی کے سلسلے میں کیا خیال ورائے کی آزادی سے پبلک کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ پبلک کے ارادۂ واختیار اور اس کی قوت و فکر کو بھی کیا حکومت قومی ملکیت قرار دے کر اپنی تحویل میں نہیں لے سکتی۔ کیا پبلک کی زبان وقلم پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ جب ایک سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی حفاظت اور اس میں مزید اضافہ کی غرض سے ہر ظلم وستم کو روا رکھتا ہے چاہے وہ مصنوعی قحط کی صورت میں ہو یا سود خواری اور سٹہ بازی کی شکل میں تو پھر انسانوں کا ایک دوسرا طبقہ اپنے ذاتی فائدوں کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ کیا حکومت کی کرسی پر پہنچ کر آدمی ذاتی خواہشات اور خود غرضی کے بندھنوں سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔ کیا اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے ہی اس کی تمام کمزوریاں اپنے آپ دور ہو جاتی ہیں۔ ساری خرابیاں درحقیقت سرمایہ کو مقصود ٹھہرانے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ سرمایہ کو کسی بلند

مقصد کے حصول کا ذریعہ تو بنایا جا سکتا ہے مگر مقصود نہیں بنایا جا سکتا۔ سرمایہ کو اصل مقصود قرار دینے کے بعد انسان سے کسی اخلاق کی توقع رکھنی فضول ہے۔ مارکس اور اس کے متبعین کے نزدیک انسانی زندگی صرف محنت اور طریقِ پیداوار سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے ایسا صرف وہی کہہ سکتا ہے جس کا مطالعہ بالکل سطحی ہو یا پھر اس کی نیت خراب ہو۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی کی بقا کے لیے غذا کی ضرورت ہے لیکن غذا کی فراوانی کے باوجود اگر انسان سے اس کے دل و دماغ چھین لیے جائیں تو اس کے پاس انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔

مارکس اور مارکس کے متبعین اگر نفسیات اور اینتھروپولوجی سے واقفیت رکھتے تو نفسیات انھیں بتاتی کہ پیداواری طاقتیں انسانی دماغ کے اعمال و افعال کی تشریح سے قاصر ہیں۔ انسانی دماغ ذرائع پیداوار کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ان پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اینتھروپولوجی انھیں اس بات سے واقف کراتی کہ روحِ انسانی جسے مارکسیت کے حاملین فریبِ محض خیال کرتے ہیں، انسانی کلچر کی پیدائش اور اس کی نشو و نما میں اسی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ وہی مادّی اسباب کو کام میں لاتی ہے اُن سے مختلف اسالیب کی تشکیل کرتی ہے مختلف اسالیب کے ذریعہ صرف اسی کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کے دل و دماغ ہیں۔ اس لیے لازماً انھیں قدروں کو سب سے اہم اور قیمتی سمجھنا چاہیے جن سے انسان کے دل و دماغ کو تسکین حاصل ہوتی ہو۔ اور انھیں نشو و نما کا موقع ملتا ہو۔ جس تہذیب و کلچر کی بنیاد حیوانی عناصر پر قائم ہو اس کی انسانی زندگی میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

کائنات صرف افادیت (جس سے ہمارے مادّی مفاد وابستہ ہیں) کی منظہر

نہیں ہے۔ اس کے اندر دوسرے اہم اور قابلِ لحاظ اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ جنہیں سمجھے بغیر کائنات کی توجیہ ممکن نہیں۔ زندگی معنی رکھتی ہے۔ مارکسیت اس کی دریافت سے قاصر ہے۔ کائنات کے اندر ہمیں کسی بلند و برتر ذات کے علم و ارادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ علم و ارادہ کی کارفرمائی ہمیشہ کسی اخلاق کے تحت ہوتی ہے۔ کائنات کے اندر کسی کے علم و ارادہ کی کارفرمائی پائی جاتی ہے، تو ہم دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کائنات میں ساری کارفرمائی اخلاق کی ہے۔ انسان کی ضروریات اور کائنات کی فراہم کردہ اشیا میں انتہائی گہرا تعلق ہے۔ جسم کو برقرار رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب انسان کے خارج میں موجود ہیں۔ یہ بہتے دریا، یہ چشمے اور میدان، یہ جانور اور مختلف قسم کے درخت، یہ پھول پھل اور کھیتیاں انسان ہی کے فطری مطالبات کا جواب ہیں۔ اسے خالقِ کائنات کی رحمت و شفقت کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اخلاقِ خداوندی کے مظاہر ہیں جنہیں ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ اخلاق کی کارفرمائی کی اس سے بھی زیادہ صاف اور روشن تصویریں ہمارے سامنے سے گذرتی رہتی ہیں لیکن ہم ان کی طرف متوجّہ نہیں ہوتے۔ ورنہ حقیقت کا علم بخشنے کے لیے وہ ہمارے لیے بہت کافی ثابت ہو سکتی تھیں۔ بچّہ کی پرورش میں اصل دخل والدین اور اعزّہ و اقربا کی اس شفقت و محبت کو ہوتا ہے جو انہیں بچّہ سے ہوتی ہے۔ یہ کھلی ہوئی اخلاق کی کارفرمائی ہے۔ شفقت و محبت کا تعلّق مادّیت سے نہیں اخلاق سے ہے۔ ایک طرف اگر ہمیں ذوقِ جمال سے نوازا گیا ہے تو دوسری طرف اس کائنات کی ساری چیزوں کو حسن و آراستگی بخشی گئی ہے۔

اسے محض مادّہ کی کرشمہ سازی قرار دے کر مطمئن ہو جانا دماغی خودکشی ہے۔ اخلاق کا مادّہ اور مادّیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کی کارفرمائیاں ہمیں ایک ایسے وجود کا جلوہ دکھاتی ہیں جسے ہم صرف "شعور" اور شخصیت یا ذات (PERSONALITY) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بے جان مادّہ میں یہ صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ ہمیں شعور و احساس کی دولت سے نوازے اور ہمیں ایک خاص طرح کے ذوق و طبیعت سے آشنا کرکے دنیا میں اس کی رعایتوں کا پورا سامان فراہم کر سکے۔ ہماری مادی ضروریات کی فراہمی کے لیے ایک اعلیٰ نظام کو وجود میں لا سکے۔ اسے "قانونِ اتفاق" سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ "اتفاق" ایک غیر متعین چیز ہے اس سے متعین اور ریاضی خصوصیات کا حامل نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا ہے۔ کائنات اور خود انسانی وجود کی کھلی شہادتیں اسی بات کے حق میں ہیں کہ اس کائنات کو کسی "اعلیٰ شعور" نے وجود بخشا ہے۔ اس لیے لازماً اس کا کوئی معیّن اور طے شدہ مقصد بھی ہو گا۔ لیکن مارکس کے نزدیک کائنات کے اندر جو کچھ ہے وہ صرف مادّیت کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ نہ اس کی کوئی غایت ہے اور نہ اس کا کوئی حقیقی مقصد۔ اس کے اندر مابعد الطبیعی عوامل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ مارکس اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ زندگی کو مادہ پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک فائق تر شے اپنے سے ادنیٰ درجے کی چیز کی تابع کیوں کر ہو سکتی ہے۔ زندگی شعور و احساس کی ایک آباد دنیا ہے جس کا سرچشمہ صرف کوئی باشعور قادر مطلق ذات ہی ہو سکتی ہے۔ اور صرف وہی ذات زندگی کا مقصود و منشا بھی قرار پا سکتی ہے۔

مادّہ پرستی اور افادی نقطۂ نظر ہی کا کرشمہ ہے کہ مارکس تاریخ انسانیت کو

معاشی (ECONOMIC) جدوجہد کی کہانی قرار دیتا ہے۔ تاریخ کی معاشی تعبیر (ECONOMICAL INTERPRETATION OF HISTORY) ہی اس کے نزدیک تاریخِ انسانی کی حقیقی تشریح ہے۔ اس لیے منطقی طور پر اس کا اخلاقی نقطۂ نظر اگر ہو سکتا ہے تو یہی کہ جو کچھ معاشی طور پر صحیح ہے وہی اخلاقی طور پر بھی صحیح ہے۔ اس تصوّرِ اخلاق پر جس نظامِ تمدن اور سیاست کی بنیاد قائم کی جائے گی اس سے کہاں تک انسانیت کو سکون و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے؟ بیان کی حاجت نہیں۔ ایسی صورت میں ہر اسٹیٹ کو صرف اپنے معاشی مفاد کی فکر ہو گی۔ اس کے لیے وہ ہر روا و ناروا طریقِ کار کو جو اس کے مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہو گا، اختیار کرے گی۔ یہ عالمگیر پیمانہ پر بدامنی اور فتنہ و فساد اسی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کی برکات ہیں، جس نے دنیا کے بڑے بڑے ذہن و دماغ رکھنے والوں کو فکر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

> "جہاں ایک طرف انسان اپنے خارجی حالات پر قابو پاتا جا رہا ہے وہاں دوسری طرف یہ عجیب منظر دیکھنے میں آ رہا ہے کہ انسان میں مجموعی طور پر اخلاقی سیرت اور اپنے آپ پر قابو رکھنے کی طاقت کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ مادّی دنیا پر تو فتح حاصل کرتا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے آپ پر قابو رکھنے میں ناکام ہو رہا ہے۔
> .... ایک طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی یہ شاندار اور حیران کن ترقی اور اُس سے پیدا ہونے والے نتائج ہیں اور دوسری طرف تہذیب و تمدن میں ایک قسم کا دماغی کھوکھلا پن ہے۔"

(مارکسزم کے بارے میں پنڈت نہرو کا نظریہ ص ۵-۶)

ڈاکٹر الکس (ALEXES CARREL) جو طب اور سائنس کے ماہرین میں سے ہیں ان کا کہنا ہے:

"اب اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں رہا کہ میکانک (MECHANIC) طبعیات (PHYSICS) اور کیمسٹری (CHEMISTRY) کے علوم ہمیں ذکاوت، اخلاقی نظام، جسمانی صحت، اعصابی توازن، قلبی سکون و راحت اور امن و امان عطا کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔"

(MAN THE UNKNOWN)

خرابیوں کی اصل جڑ زندگی کا وہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے جسے عالمگیر پیمانے پر اختیار کر لیا گیا ہے۔ مادہ پرستی کے خلاف پر زور اور مدلّل آواز اٹھانے کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی سے مادّہ پرستی کا کوئی جوڑ نہیں۔ مادّیت انسانی زندگی میں امن وسکون اور عدل وانصاف کی فضا قائم کرنے میں قطعًا ناکام ہے۔ مادیت نے انسان کو وطن و نسل اور رنگ و زبان وغیرہ غیر حقیقی بنیادوں پر تقسیم کرکے زمین کو فتنہ و شر سے بھر دیا۔ مادیت انسان کو صحیح، متوازن اور مکمل اخلاقی ضابطۂ حیات جس میں ہمارے تمام فطری مطالبات پورے ہوسکیں، عطا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے انسان ہمیشہ معنوی و روحانی نقطۂ نظر کا محتاج رہے گا۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو صرف مادّی نقطۂ نگاہ رکھتے تھے، اس طرز پر سوچنے کو مجبور ہو رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

"ملک کی مادّی خوش حالی کے لیے کوشش کرتے وقت ہم نے انسانی فطرت کے روحانی عنصر کی طرف کوئی توجّہ نہیں دی اس لیے افراد کو اور پوری قوم کو ایک مقصد کا احساس دلانے کے لیے ایسا

مقصد جس کے لیے انسان زندہ رہے اور ضرورت پڑے تو مرنے کے لیے بھی تیار ہو جائے، ہمیں زندگی کے کسی فلسفہ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیے اور زیادہ وسیع معنوں میں اپنے خیالات کے لیے روحانی پس منظر مہیا کرنا چاہیے .... دماغ ایسی بنیادی چیز کی تلاش میں ہے جو اس مادی دنیا کی پشت پر ہے۔ اگر ہم نے زندگی کے اصول کے اس جامع تصور میں یقین کر لیا تو اس کی وجہ سے شاید ہم نسل، ذات پات یا طبقہ کے بندھنوں سے نجات حاصل کر سکیں اور زندگی کے مسائل کے نقطہ نظر کے بارے میں زیادہ رواداری اور سمجھ پیدا کر لیں۔"

(پنڈت نہرو کا نظریہ بحوالہ اکانولک ریویو ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء)

اخلاق کا اعلیٰ تصور وہی ہو سکتا ہے جس میں فرد کی بہبود اور اجتماعی حیثیت سے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا راز پوشیدہ ہو۔ جس سے ہمارے سارے مسائل حل ہوتے ہوں۔ ہماری مشکلات آسان ہو جاتی ہوں۔ جس سے ہمارے دل و دماغ کو حقیقی سکون و راحت حاصل ہو اور جس سے دنیا سے ظلم و فساد کا خاتمہ ممکن ہو۔

برفو (BRIFFAULT) نے لکھا ہے :۔

"عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ قوت سے غالب نہ آسکے .... اگر دنیا میں باطل کوئی معنی رکھتا ہے تو یہی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض فرضی اقتدار کی بنا پر اپنا تابع فرمان بنا لے ...... اس باطل کا

استیصال اخلاقیات کا کم سے کم فریضہ ہے۔ مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی عظیم وشاندار عمارت آپ تعمیر کرلیں اگر وہ باطل کو مٹا کر اس کی جگہ حق کو قائم کرنے سے قاصر ہے تو وہ بالکل بے معنی ہے۔ اس اوپر کی عمارت کو اخلاقیات کی عمارت کہا ہی نہیں جا سکتا۔"

(THE MAKING OF HUMANITY)

اخلاق کا ایسا بلند تصور جس سے باطل کا کلیتہً استیصال ممکن ہو صرف اسلام دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اخلاق کا ایسا وسیع اور بلند تصور نہ یونانیات میں ملتا ہے اور نہ مسیحی رہبانیت میں اور نہ مادیت ایسا وسیع اور بلند اخلاقی نقطۂ نظر پیش کر سکتی ہے۔ اسلام نے اخلاق کو عالمگیریت اور آفاقیت عطا کی ہے۔ اسلام نے اخلاق کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں صرف انھیں کے ذریعہ افراد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ صرف انھیں کے ذریعہ ایک خدا کی حاکمیت (SOVEREIGNTY) اور آقائی کے علاوہ زمین پر سے دوسروں کے اقتدار اور حاکمیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ صرف انھیں کے ذریعہ ہماری اندرونی زندگی میں توازن پیدا ہو سکتا ہے اور ہم دماغی و روحانی سکون حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف اسلام کے پیش کردہ اخلاقی نقطۂ نظر کے تحت انسانی معاشرے میں عالمگیر پیمانے پر عدل وانصاف کا قیام ممکن ہے۔ صرف اسی کے ذریعہ جور واستبداد کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ایسا اخلاقی نقطۂ نظر مادیت کے اندر موجود نہیں ہو سکتا، جو انسان کو ذاتی خود غرضیوں اور قوم و وطن اور رنگ ونسل کی حد بندیوں سے آزاد کر کے اسے دوسرے انسانوں کا ہمدرد و بہی خواہ بنا سکے۔ جو آدمی کے اندر ایثار واخوت اور انسان دوستی کا

جذبہ پیدا کر سکے۔

مادّیت خود مادیت کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہورہی ہے۔ DR. REENES کہتے ہیں اور کتنا صحیح کہتے ہیں:

"ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ بین الاقوامی تعلقات کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم (NATIONALISM) نے انسانی معاشرے میں جو خلجان پیدا کیا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان دور ہونے کا نہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ بین الاقوامیت نہیں، نوعِ انسانی کی برادری ہے۔"

اسلام عالمگیر برادری کا ممکن العمل تصوّر پیش کرتا ہے وہ سارے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی اور شریک رنج وغم وراحت بناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی زمین محبّت اور باہمی اتحاد کے لیے ہے۔ فتنہ وشر برپا کرنے کے لیے خدا نے انسانوں کو یہاں نہیں بسایا ہے۔ وہ رنگ ونسل اور وطن وغیرہ انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ تعبّد الٰہی کی وحدت پر ایک عالمگیر اتحاد واخوت کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک رنگ ونسل اور زبان ووطن کی بنیاد پر انسانی تفریق وتقسیم جائز نہیں۔ اس کے نزدیک انسان کے لیے حقیقی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو اُسے اس کے رب سے متصل کرتا ہے چونکہ انسانوں کا رب ایک ہے اس لیے انسانوں کو بھی ایک ہونا چاہیے۔ یہی اسلام کی دعوت وحدت اور عالمگیر اخوت کا وہ سبق ہے جو تمام انسانوں کو باہم جوڑ سکتا ہے۔ ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے ملا سکتا ہے۔

ایک ایسی انسانی برادری وجود میں لاسکتا ہے جو خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے۔ ایک ایسی برادری وجود میں لاسکتا ہے جس کے افراد اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہوں۔ دوسروں کو آرام و راحت پہنچانے کی غرض سے خود تکلیف و مشقت برداشت کرتے ہوں۔ مختلف نسل اور مختلف ملک کے لوگوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہوں۔ یہ محض کوئی نظریہ نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عملاً اس طرح کی برادری وجود میں آچکی ہے۔ نوعِ انسان کی ایک عالمگیر برادری آج بھی وجود میں آسکتی ہے بشرطیکہ انسان دنیا میں مادی مفاد کے لیے نہیں بلکہ اپنے خدا کے لیے جینا سیکھ جائے۔ کاش مسلم قوم آج دنیا کے سامنے اپنے عالمگیر برادری ہونے کا صحیح نمونہ پیش کرتی تو دنیا کو اسلام کے پیش کردہ اخلاقی نظام کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوسکتا!